جاتا تو پھر حقیقت حال واضح ہوتی، اور سارا پردہ ہی بے نقاب ہوتے، مگر دین متین کے تمام حقائق اور اس کے ابدی اسرار کو بے نقاب کر دینا تو ظاہر ہے کہ کسی ایک عالم یا کسی ایک دور کے تمام علماء کے بس کی بات نہیں ہو سکتی۔ اسی لئے نئے مسائل میں بجائے علماء کے اقوال کی طرف رجوع کرنے کے سب سے پہلے قرآن اور حدیث کی طرف براہ راست توجہ کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔ اور یہ ایک صحیح اور متفق اصول ہے، جس میں دو رائیں نہیں ہیں۔

بہر حال راقم سطور کا خیال ہے کہ یہ مغالطہ سب سے پہلے غالباً علامہ ابن جریر (م ۳۱۰ ھ) ہی کو پیش آیا ہے اور علامہ ابن حزم (م ۴۵۶ ھ) نے شاید انہی کی پیروی کی ہے۔ مگر اس سلسلے میں سب سے زیادہ حیرت انگیز رویہ ہمارے کرم فرما تنقید نگار کا ہے جنہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اپنے فتنہ انگیز نظریات و مقاصد کی تائید میں جہاں کہیں سے بھی کوئی ذرا سا اشارہ بھی اگر ملتا نظر آئے فوراً بالکل اناپ شناپ طریقے سے اسے جھپٹ کر حاصل کرنے اور عوام کو گمراہ کرنے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ اور پھر اگر کسی "تائیدی قول" میں تو باتیں ان کے خلاف اور صرف ایک بات ان کے حق میں جاری ہو تب بھی وہ نو مخالف باتوں کی پرواہ کئے بغیر صرف ایک تائیدی بات سے استدلال کرنے میں ذرا بھی نہیں ہچکچاتے، خواہ اس کا نتیجہ آگے چل کر کچھ ہی کیوں نہ ہو جائے۔ اور حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کرنا اور اس میں نمک مرچ لگا کر اسے "دو آتشہ" بنا دینا ان کا محبوب اور دل پسند مشغلہ معلوم ہوتا ہے۔ اور وہ علمی شعبدوں کے ذریعہ عوام کو فریب میں مبتلا کر کے چند وقتی و عارضی فوائد اور عوامی ہمدردیاں حاصل کرنے کے درپے نظر آتے ہیں۔

بہر حال معترض نے علامہ ابن حزم کی تحریر سے اپنے مفادات حاصلہ

کی خاطر جس طرح استدلال کیا تھا۔ بالکل اسی طرح ابن جریر طبری کی مذکورۃ بالا تحریر اور ان کی رائے کا بھی استعمال کرتے ہوئے اپنی خود غرضی اور نفسانیت کا مظاہرہ کیا ہے۔ مگر وہ اپنی اس کوشش میں بری طرح ناکام بلکہ چاروں شانے چت نظر آتے ہیں۔ چنانچہ اوپر مذکور تصریح کے مطابق طبری نے فی سبیل اللہ سے غازی مراد ہونے پر جو واحد قول (ابن زید کا) نقل کیا ہے۔ اُسے دیکھ کر معترض کی باچھیں کھل گئیں، اور منہ میں پانی بھر آیا، تو انھوں نے بے ساختہ دعویٰ کر دیا کہ اس سلسلے میں کسی قسم کا اختلاف ہی نہیں ہے، جیسا کہ وہ تحریر کرتے ہیں۔

• طبری کا دستور یہ ہے کہ آیت کی تفسیر میں اگر اختلاف ہوتا ہے تو عموماً مختلف اقوال کو ذکر کر کے کسی قول کو ترجیح دیا کرتے ہیں۔ لیکن انھوں نے فی سبیل اللہ کے بارے میں کوئی اختلاف ذکر نہیں کیا۔[1]

مگر جیسا کہ راقم سطور نے اوپر صراحت کی ہے کہ ابن جریر طبری اپنی تفسیر میں صرف وہی اقوال و روایات درج کرتے ہیں جو بسند ان تک پہنچی ہوں۔ اس کے برعکس وہ ان روایات سے کوئی تعرض نہیں کرتے، جو ان تک بسند نہ پہنچی ہوں۔ لہٰذا اس سے عدم اختلاف کا دعویٰ کرنا صحیح کیسے ہو گیا؟

(جاری)

---

[1]: ماہنامہ الفرقان، اپریل ۱۹۸۸ء ص ۳۶۔

مولانا ابوالکلام آزادؒ
ایک مطالعہ

انتر امام عادل، سمستی پوری، معین مدرس دارالعلوم، دیوبند۔

امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت ایسی پیچ در پیچ اور پر اسرار ہے کہ خود ان کے معاصرین ان کی حقیقت کی تہ تک نہیں پہونچ سکے جس کا خود حضرت امام الہند کو بھی شکوہ تھا۔ چنانچہ اپنی زندگی کی آخری گھڑی میں نہایت مایوسانہ اور دردمندانہ انداز میں اپنے کو مخاطب کرکے فرماتے ہیں۔

تو نظیری ز فلک آمدہ بودی چو مسیح۔!
باز پس رفتی و کس قدر تو نہ شناخت دریغ!

جب اس آسمانی مسیح کے مانند کو ان کے ہم زمانہ لوگ نہ پہچان سکے، تو آج کی نوخیز نسل ان کے عرفان و شناخت کا دعویٰ کیسے کر سکتی ہے؛ جس کے پاس اب کی صرف تحریریں اور علمی نقوش باقی رہ گئے ہیں۔ اور اب وہ حضرت امام الہند کے خط وخال، قد و قامت، احساسات و تصورات، مزاجی کیفیات، طبعی افتاد، علمی گہرائی و گیرائی، مذہبی استقامت و پائیداری، ذہنی رجحانات اور اندرونی اسرار و حقائق کا علم صرف انہی قلمی نقوش کے ذریعہ حاصل کر سکتی ہے

ان تمام احساسات کے ساتھ حضرت امام الہند کی زندگی کے بارے میں چند باتیں عرض کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ جس سے آپ ان کی تاریخی، مذہبی، علمی و فکری حیثیت کا ہلکا سا اندازہ کر سکیں گے۔

حضرت امام الہند کا خاندان انتہائی مقدس ہے، مادری و پدری دونوں طرف اکابر اولیاء اللہ اور نامور علماء کرام کا ایسا سلسلہ ہے جس کو سلسلۃ الذہب کہنا زیادہ مناسب ہے۔ اوپر سے لیکر نیچے تک پورے خاندان کی تفصیل تو یہاں بیان نہیں کی جا سکتی، البتہ ان کے والد ماجد مولانا خیرالدین احمد دہلی کے باشی اور اپنے وقت کے ایک جید عالم اور نامور بزرگ تھے، آپ کا حلقۂ بیعت و ارادت بنگال، گجرات، بمبئی، بلکہ سیلون و افریقہ تک پھیلا ہوا تھا، وہ قدیم مشرقی روایات کے حامل، اور اسلامی تہذیب کے دلدادہ انسان تھے، ان کو مغربیت اور انگریزی تہذیب سے سخت نفرت تھی۔

لیکن جب برطانوی اقتدار ہندوستان پر مسلط ہوگیا، اس کا جبر و تشدد حد سے بڑھ گیا، تو ۱۸۵۷ء میں یہ حجاز کی جانب ہجرت کر گئے، اور مکہ کے دامنِ امن میں پناہ گزیں ہوئے، جب ترکی کے حاکم سلطان عبدالحمید کو ان کی ہجرت، اور ترک وطن کا علم ہوا تو ان کو قسطنطنیہ آنے کی دعوت دی، آپ ان کی دعوت پر کچھ دن وہاں قیام پذیر رہے، پھر حجاز واپس تشریف لائے، مدینہ منورہ کے مفتی اعظم شیخ محمد طاہر کی بھانجی سے آپ کا نکاح ہوا، اور بعد میں چل کر یہی وہ خوش قسمت ماں بنیں، جن کے بطن سے ستمبر ۱۸۸۸ء مطابق ذی الحجہ ۱۳۰۵ھ میں مولانا آزادؒ پیدا ہوئے، ابتدائی دس سال تک مکہ معظمہ کی روحانی و مقدس فضا میں آپ کی پرورش ہوئی، وہ آب و ہوا آپ کے وجود میں سرایت کرتی رہی، جسے دیارِ رسول میں تحمید دشمن کرنے کا فخر حاصل تھا۔

ان سنگریزوں سے آپ نے کھیلا، جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے مقدس اصحاب کی قدم بوسیوں کی سعادت مل چکی ہے ـــــ پھر یہ دمشق سلین کے پیہم اصرار کی وجہ سے مولانا خیرالدین ۱۸۹۸ء میں پھر ہندوستان واپس تشریف لائے، اور کلکتہ کو اپنی مستقل قیامگاہ کی حیثیت سے منتخب کیا ـــــ اس طرح مولانا آزاد کا آبائی وطن دہلی، اور مادری وطن کہ معظمہ ہے، مولانا آزاد نے ان گودوں میں پرورش پائی ہے۔ جس کا سرمایۂ افتخار حیات دنیوی نہیں، بلکہ فقر و مسکینی تھا۔ جو ان کو خاندانی وراثت کے طور پر ملی تھی۔

مولانا آزاد کو اللہ پاک نے جو فطرت اور طبیعت عطا کی تھی وہ خلوت پسند، جلوت سے حتی الامکان گریز کرنے والی، اور علم و فکر کی طرف مائل تھی، اسی کا اثر تھا کہ وہ اپنے بچپنے ہی سے کتاب سے محبت و پیار رکھتے تھے، اور تمام وسائل لہو و لعب کے ہوتے ہوئے ان کو کتاب سے بڑھ کر کسی چیز سے دلچسپی نہیں تھی، وہ اکثر تنہائیوں اور سنسان جھاڑیوں میں نکل جایا کرتے تھے، جہاں انہیں کوئی نہ پا سکے، اور اس طرح وہ یکسوئی کے ساتھ کتابوں کا مطالعہ کر سکیں۔ اسی کتابی مطالعے، اور علمی شغف نے ان کو آگے چل کر اپنے وقت کا متبحر عالم دین اور مبصر ترجمان اسلام بنایا ـــــ یہ الگ بات ہے کہ انہوں نے اپنے علم و فکر کو عام روایتی علماء کی طرح حاصل نہیں کیا، اور نہ اس طرح اسے استعمال کیا، بلکہ قدرت کی طرف سے ان کو حصول علم کے لئے بھی الگ راہ دی گئی، اور اس کے استعمال کے لئے بھی انہوں نے علم کسی مدرسہ یا مکتب سے نہیں حاصل کیا، بلکہ اپنے گھر ہی بیٹھ کر اولاً اپنے والد ماجد اور پھر مخصوص علماء و کبار سے تکمیل کی، یہ ان کی طبعی ذکاوت و ذہانت کا ثمرہ تھا، پھر اپنی ذہانت و ذکاوت کے بل بوتے علوم عصریہ

انگریزی وغیرہ آپ نے حاصل کی، اور اس کے بعد اپنی اس فکر و شعور کو جو علوم اسلامیہ کی تحصیل سے ان کے اندر پیدا ہوا تھا، اسلام اور اہل اسلام کی بھرپور خدمت کی جس کو تاریخ ہمیشہ یاد رکھے گی۔

یہاں سے مولانا کی زندگی اور ان کی خدمات دو حصوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں، ایک سیاسی خدمات، اور دوسرے مذہبی و علمی خدمات، ہم اپنے اس مضمون میں اس بات کی کوشش کریں گے کہ آپ کی علمی حیثیت نمایاں اور آپ کے مذہبی و دینی خدمات کو اجاگر کیا جائے۔ اس لئے کہ سیاست و علم دونوں مولانا آزاد کے اندر اتنے بھرپور انداز میں جمع ہو گئے تھے کہ یہ امتیاز نہیں کیا جا سکتا کہ مولانا اصل میں کس میدان کے آدمی تھے، اور آپ کا قلبی میلان و ذہنی رجحان کس طرف زیادہ تھا؟ —— لیکن ان کی خاندانی روایات، مذہبی خدمات، اور خود ان کی بھی زندگی کے پیش نظر زیادہ صحیح یہ ہے کہ مولانا در اصل ایک عالم دین، اور ترجمان اسلام تھے، ان کی صلاحیت ولیاقت کی وجہ سے خود سیاست ان کو کھینچ کر میدان عمل میں لائی تھی، جیسا کہ وہ خود فرمایا کرتے تھے کہ میں نے سیاست کو نہیں ڈھونڈا بلکہ سیاست ہی نے مجھ کو ڈھونڈھ نکالا ہے۔

بچپن ہی میں صحافت کا ذوق پیدا ہوا، اور اس کی طبع آزمائی کرنے لگے چنانچہ ابتدائی مرحلوں کو طے کرنے کے بعد مولانا آزاد کی ادبی زندگی چودہ برس عمر کے بعد شروع ہوئی، اور "لسان الصدق" نامی ایک ماہوار جریدہ نکالنا شروع کیا۔ جس کا عوام و خواص پر اچھا خاصا اثر پڑا، مولانا الطاف حسین حالیؔ نے اس کی تعریف کی۔ ۱۹۰۴ء میں مولانا حالیؔ کی جب مولانا آزاد سے ملاقات ہوئی تو انہیں یقین نہ آیا، کہ اتنا نو عمر لڑکا "لسان الصدق" جیسے

بلند پایہ اخبار کا ایڈیٹر ہو سکتا ہے! لیکن ان کا شک بہت جلد دور ہو گیا، اسی زمانہ میں مولانا شبلی سے خط و کتابت شروع کی، پھر مولانا شبلی کی عراق سے واپسی پر بمبئی میں مولانا آزاد کی ان سے ملاقات ہوئی اور مولانا شبلی پر آپ کے جوہر کھلے، تو "الندوۃ" کی ادارت آپ کے سپرد کر دی، لیکن سات آٹھ مہینہ کے بعد یہ سلسلہ بند ہو گیا ــــــ اور ماہنامہ وکیل کی ایک سال تک ایڈیٹری کی، پھر کسی وجہ سے وہ وہاں سے کلکتہ چلے آئے، تو کلکتہ کے ہفت روزہ اخبار "دارالسلطنت" کی ادارت آپ کو سونپ دی گئی، پھر اس کو بھی ترک کر کے اپنا مستقل پرچہ "الہلال" اور "البلاغ" نکالنا شروع کیا، جس نے تو پورے ملک کی کایا پلٹ کر رکھ دی، اور اس کے ذریعہ آپ نے اسلام کی وہ زرّیں خدمات انجام دیں، جن کو تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی ــــــ اور جو وقت کی عین ضرورت تھی، اس لئے کہ یہ وہ تشویشناک وقت تھا، جس سے ہندوستان کی تمام قوموں کا امن و سکون غارت ہو چکا تھا، خاص طور پر مسلمانوں کا دین دنیا دونوں خطرہ میں تھے، اور باہمی اختلافات و انتشارات گروہ بندیاں، نئے نئے تخیلات، مسلم رہنماؤں سے بے اعتمادی، انگریزوں کی غلامی پر قناعت، اور اپنے مستقبل کی تعمیر کی طرف سے بے توجہی یہ سب زہر بن کر مسلم قوم کی ارتقائی بنیادوں کو کھوکھلی کر رہے تھے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہے کہ بنیادیں بہت حد تک منہدم ہو چکی تھیں، علی گڑھ میں سرسید احمد کی تحریک کے زیر اثر ایک تعلیمی ادارے کی بنیاد ڈالی جا چکی تھی، جس کا مقصد برطانوی سامراج کی اعانت، انگریزی سرکار کے ساتھ وفاداری، اور اسلام کے عنوان پر مسلمانوں کے دین و ایمان، اور قرآن و مذہب سے کھلواڑ تھا۔ جس میں مسلمان بچے کثرت کے ساتھ داخل ہو رہے تھے، مولانا محمد علی جیسا زبردست انسان

بھی اب تک علی گڑھ تحریک کی موافقت کر رہا تھا دوسری طرف اس علی گڑھ کالج کے تعلیمی اثر سے مسلمانوں کو ترقی کا خیال آیا، اور ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کی بنیاد ڈالی گئی، مگر وہ بھی اپنے مقصد میں اس قدر ناکام اور بنیادی اعتبار سے اس قدر پست ثابت ہوا کہ مت پوچھئے، تیسری طرف روایتی علماء و مشائخ کی خانقاہ نشینی وخلوت گزینی اور قومی وملی مسائل سے بے توجہی و لاپرواہی، کہ تھوڑی دیر کے لئے بھی وہ اپنی خانقاہوں اور مدرسوں کی چہار دیواری سے باہر جھانکنے کو تیار نہیں تھے، چاہے مسلمانوں کی گردنیں کٹ کر ڈھیر ہو رہی ہوں، ان کی لاشیں زمین پر تڑپ رہی ہوں، اور ان کے خون سے پوری زمین سرخ زار بنی ہوئی ہو ـــــ اس بحرانی وقت میں مولانا ابوالکلام آزاد اپنے ضمیر کی آواز کو قابو میں نہ رکھ سکے، ان کی فکر و شعور کو سخت ٹھیس پہونچی، اسلامی حمیت بھڑک اٹھی، اور انہوں نے ارادہ کیا کہ پوری سوئی ہوئی قوم کو بیدار کیا جائے، اس کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا جائے، اور ۱۹۱۲ء میں انہوں نے اخبار الہلال کا اجراء کیا، جس کا مقصد اسلام اور مسلمانوں کی صحیح نمائندگی، مذہب وملت کی پائیدار خدمت میں مسلمانوں کے ذہنی وعملی جمود و تعطل پر ضرب کاری، اور مسلمانوں کی عظمت رفتہ کی بازیابی کی کوشش تھی، الہلال کے صفحات آج بھی جہاں موجود ہیں وہ گواہ ہیں، کہ اس نے مسلمانوں ہی کو نہیں، بلکہ پوری ہندوستانی قوم کو اس طرح جھنجھوڑا ہے، جس کی مثال ایک زمانے تک نہیں ملتی ہے، الہلال کے ذریعے وقت کے بڑے سے بڑے لوگوں کو بیداری ہوئی، اور انہوں نے وقت کے تقاضا کو سمجھا، یہاں پر حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ کا وہ مخلصانہ اعتراف بہت اہم ہے، کہ الہلال نے ہم کو اپنا

نصب العین یاد دلا دیا، اس نے مولانا محمد علی اور علامہ اقبال کو اسلام کی راہ دکھائی۔ اور وہی مولانا محمد علی جو اب تک علی گڑھ کے بارے میں الہلال کی مخالفت کر رہے تھے، بعد میں خود الہلال کے مقلد ہو گئے، اور اسی کی طرز میں اپنے مشہور زمانہ اخبار "کامریڈ" میں مضامین لکھے، ـــــ شاعر مشرق علامہ اقبال کی مثنوی "اسرار خودی" اور "رموز بے خودی" اسی الہلال کی معکوس صدائیں ہیں۔ یہ سب دلیلیں ہیں، ہفت روزہ الہلال کی کامیابی کی۔

۱۹۱۲ء میں جنگ بلقان، اور جنگ طرابلس چھڑ گئی، جس کی وجہ سے مسلمانوں کو ترکوں کے ساتھ محبت و اخوت پیدا ہوئی، ان جنگوں میں اسلامی ممالک کو وقتی نقصانات کا سامنا کرنا پڑا، جسے مولانا آزاد کا آزاد ذہن و قلم کبھی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ اپنے قلم کی شعلہ نگاری سے مغربین کے خرمن میں ایسی آگ لگائی، کہ حکومت بھڑک اٹھی، اور بالآخر ۱۹۱۵ء میں ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کی تلوار کی زد سے یہ الہلال ہمیشہ کے لئے ذبح ہو گیا، اور الہلال کی ضمانت ہمیشہ کے لئے ضبط کرلی گئی۔

مگر وہ مرد آزاد جو اپنے دل میں مسلمانوں کی خدمت، اور اسلام کی بلندی کا جذبہ لے کر پیدا ہوا تھا، وہ کیسے خاموش رہ سکتا تھا، اس کو اپنی آواز ملک بھر میں پہونچانی تھی، چاہے جس راستے سے ہو، چنانچہ اس نے الہلال پر پابندی کے بعد ایک دوسرے اخبار "البلاغ" کا اجرا کیا، اور نسبتاً کچھ نرم انداز میں اپنی سرگرمیاں دکھانی شروع کیں، لیکن البلاغ کی تاب بھی حکومت نہ لا سکی۔ اور ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ نے اس کو بھی گھورنا شروع کیا، اور نتیجہ اس کا بھی وہی ہوا، جو الہلال کا ہوا تھا، یعنی اس کا گلا بھی ہمیشہ کے لئے گھونٹ دیا گیا۔ اور صرف اسی پر اکتفا نہیں

ہو گیا۔ بلکہ مولانا آزاد کی اس جرأت شانہ، اور بڑھتی ہوئی آزاد خیالی، اور خودداری کی وجہ سے حکومت بنگال نے صوبہ میں آپ کے قیام کو مناسب خیال نہ کیا، اور صوبہ بدری کا حکم دے دیا۔ ۱۹۱۶ء ۲۳ مارچ کو آپ کو اطلاع دی گئی، کہ ایک ہفتے کے اندر آپ بنگال چھوڑ دیں، ـــــ پہلے ہی سے یوپی گجرات، مدراس، بمبئی وغیرہ داخلہ پر پابندی لگ چکی تھی، اب غور و فکر کے بعد رانچی زیادہ مناسب معلوم ہوا، اس لئے کہ وہاں جہالت کی گھٹا اور گمراہی تھی، اسلام بیزاری، اور مردہ ضمیری اپنی انتہا کو پہونچی ہوئی تھی ـــــ

چنانچہ ۳۰ مارچ ۱۹۱۶ء کو آپ رانچی تشریف لے گئے، اور وہاں آپ اصلاحی فکری اور علمی امور میں مشغول ہو گئے، اور مسلمانوں کے احساسات اور جذبات کو جھنجھوڑنا شروع کیا، اور ان کے قلوب میں اسلام کی روح ڈالنے، اور ان کو، مذہب و ملت کے سرچشمۂ حیوان تک پہونچا دینے کا ارادہ کیا۔ مگر ظالم انگریز نے وہاں بھی مولانا کے پروگرام میں اڑچنیں ڈالیں، اور رکاوٹیں پیدا کیں، یہاں تک کہ آپ کو رانچی جیل میں نظر بند کر دیا گیا۔ اور آپ کا تمام مسلمانوں سے بلکہ تمام اقوام سے مقاطعہ اور سوشل بائیکاٹ کر دیا گیا، نظر بندی کا یہ سلسلہ چار سال تک جاری رہا، چار سال کے بعد ۱۹۲۰ء میں آپ کو رہائی ملی، اس کے بعد آپ کی عملی سیاست کا دور شروع ہوتا ہے، اس چار سال کی مدت میں آپ نے علمی طور پر کیا خدمات انجام دی ہیں۔ اور مسلم قوم کو تعلیمی اعتبار سے کہاں تک آگے پہونچایا ہے، وہ ان کے تذکرہ، ترجمان القرآن، اور دوسری تبلیغی و انقلابی کتابوں سے سمجھا جا سکتا ہے، اس کے علاوہ رانچی جیسی اندھیر نگری میں، دین و ایمان کی ایسی مشعلیں جلائیں، وہ مدرسے اور تبلیغی و اصلاحی ادارے قائم کئے، جن کی بدولت رانچی اب وہ رانچی نہ رہا، جو پہلے تھا، بلکہ اب

تھے وہاں سے فیوض کی بارش ہونے لگی، اور علوم اسلامیہ کی تقسیم وہاں سے لگی ۔۔۔ یہ فراموش نہ کیجئے کہ مولانا آزاد اب تک عملی طور پر سیاست میں داخل نہ ہوئے تھے، یہ پورا دور جس کا ذکر آپ پڑھ چکے ہیں، یہ آپ کی علمی مسیحائی کا دور ہے، اور اب تک آپ نے جتنے علمی ادبی، فکری اور انقلابی کارنامے انجام دیئے وہ ایک عالم دین، ترجمان اسلام، مفکر وقت اور داعئ انقلاب کی حیثیت سے انجام دیئے، اس میں سیاست کو دخیل قرار دیا جا سکتا، اگر کسی حد تک سیاست اس میں مان بھی لی جائے تو وہ ثانوی درجے میں ہے، جوہر مفکر محقق اور انقلابی عالم کی دعوت میں ناگزیر ہے ۔۔۔ اگر آپ کو اس وقت کی مذہبیت، اصلاحی ذوق، خدا پر اعتماد و توکل، اور مذہب سے والہانہ لگاؤ کا اندازہ کرنا ہو تو خود مولانا کی زبانی نظر بندی کا پورا نقشہ ملاحظہ کیجیے، تذکرہ میں تحریر فرماتے ہیں۔

"۲۳ر مارچ ۱۹۱۶ء کو گورنمنٹ بنگال نے ڈیفنس ایکٹ کی دفعہ ۳ کی بنا پر حکم دیا کہ ایک ہفتہ کے اندر حدود بنگال سے باہر چلا جاؤں، ان الحکم الا للّٰہ

رونا کہاں ہوا مجھے دل کھول کر نصیب
دو آنسوؤں میں نوح کا طوفان آگیا

معلوم نہیں دنیا کو چھوڑنا مشکل ہے یا آسان! لیکن الحمد للہ کہ ہم کو دامن جھاڑ کر اٹھ کھڑے ہونے میں کوئی مشکل پیش نہ آئی، ہر چند دل کو ٹٹولا، مگر کوئی علاقہ بھی دامن گیر نہ تھا، اور نہ ہی جمعیت خاطر و فراغ قلب نے ایک لمحہ کے لئے ساتھ چھوڑا۔"

غور کیجئے کہ اگر صرف سیاست پیش نظر ہوتی تو یہ طمانیت کی دولت

ہ کو کہاں نصیب ہو پاتی ؟ آگے اپنے قلب کی حالت اس طرح بیان کرتے ہیں۔

" اسی اثنا میں رمضان المبارک کی برکات و نعائم کا ورود شروع ہوا اگرچہ نماز با جماعت کی کیفیت انجمن طراز، اور جماعت تراویح و سماع کی تلاوت کی لذت دل نواز سے اپنی عمر میں پہلی مرتبہ محروم رہا ، اور اس لئے ابتدا کے دوچار دن گونہ انقباض و دل گرفتگی میں بسر ہوئے ، لیکن اس کے بعد محرومی خلوت وانزوا کی کیفیتوں اور انجمن درخلوت کی خود رفتگیوں کا عالم کچھ اس طرح طاری ہوا، کہ دنیا جہاں کی ساری صحبتوں اور انجمنوں سے دل بے پرواہ ہوگیا۔ علی الخصوص عشرۂ آخیرہ کی شبہائے تمنا، اور روزہائے انتظار کی بخششوں اور کامرانیوں سے دل نے جو جو سعادتیں پائیں، اور چشم وگوش نے لطفِ دید و ذوقِ سماع کی جو جو دولتیں پائیں، نہ دنیا کی کوئی زبان ان کی ترجمانی کرسکتی ہے، نہ سامعہ استعداد سماع رکھتا ہے ، البتہ حسرت رہی تو یہ رہی کہ کاش پوری زندگی کی وسعت ان دس راتوں میں آجاتی، اور ساری عمر اسی عالم میں بسر کر جاتے۔

شب وصال بہت کم ہے آسماں سے کہو
کہ جوڑ دے کوئی ٹکڑا شبِ جدائی کا "

کوئی کہہ سکتا ہے؟ کہ یہ کسی سیاسی انسان کی زبان ہے، خالص صوفی، عالم اور نہایت بزرگ انسان کی زبان معلوم ہوتی ہے۔ جس کو انکشافات و مشاہدات ہو رہے ہوں، اسی لئے تو وہ تمنا کرتا ہے کہ کاش پوری زندگی انہی دس راتوں میں سما جاتی — کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ کوئی محض سیاسی

انسان جیل میں رہنے کی ایسی تمنا کرے گا؟ قید و بند کی سختیوں، اور زنداں کی دیواروں سے اتنا پیار کرے گا؟ اور اس کی تلخ کامیوں کو اتنی لذت کشی اور فرحت اندوزی کے ساتھ برداشت کرلے جائے گا؟ ہرگز نہیں، یہ بغیر اس کے ممکن نہیں کہ وہ اللہ کا برگزیدہ بندہ، عالم دین، متبحر مفکر، اور محقق شخص ہو، ـــــ مولانا آزاد کو اس شعر سے خراج عقیدت پیش کیجئے۔

سہ
تری نوا سے ہے بے پردہ زندگی کا ضمیر
کہ تیرے ساز کی فطرت نے کی ہے مضرابی

مولانا کی کچھ اور بھی آوازیں سنتے چلئے جو آج تک دنیائے ادب میں گونج رہی ہیں، وہ اپنے دل کے سوز و گداز، جگر کی فروزی، روح کی خلش، سینہ کی تپش اور اپنے کارناموں کی طرف کتنا مبہم اور کتنا درد انگیز اشارہ کرجاتے ہیں۔ سینہ کو تھام کر ملاحظہ کیجئے۔

• میرا چہرہ بدن ان کروڑوں بندگان خدا کی زندگیوں کا بے زبان ترجمان ہے، جو سکونِ حیات سے محرومی کا مرثیہ پڑھنے پر بھی قادر نہیں، ـــــ میری پلکوں آنکھوں میں فلک کج رفتار کی وہ سب گردشیں سمٹ کر آگئی ہیں۔ جن سے مجھے عمر بھر کھیلنا تھا، میری نظریں مشاہدہ کا قدرت کی زبین ہے، اور ان کی دوربین قوت نگاہ ملنے والے ہر انسان کی کتاب عارض میں وہ حقیقتیں تلاش کرلیتی ہیں جن سے وہ خود بھی واقف نہیں ہے، ـــــ میرے رخساروں کے جھریاں تقدیر عالم کی پیشانی پر ابھرتی ہوئی شکنیں ہیں، میرے ماتھے پر کبھی کبھی آپ کو بساطِ شبنم کا دھوکہ ہوتا ہے، حالانکہ یہ سب کچھ مری حرارت قلب و جگر، اور سوزش نفس کا ہی ایک

انگریزی وغیرہ آپ نے حاصل کی، اور اس کے بعد اپنی اس فکر و شعور کو جو علوم اسلامیہ کی تحصیل سے ان کے اندر پیدا ہوا تھا، اسلام اور اہل اسلام کی بھرپور خدمت کی جس کو تاریخ ہمیشہ یاد رکھے گی۔

یہاں سے مولانا کی زندگی اور ان کی خدمات دو حصوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں، ایک سیاسی خدمات، اور دوسرے مذہبی وعلمی خدمات، ہم اپنے اس مضمون میں اس بات کی کوشش کریں گے کہ آپ کی علمی حیثیت نمایاں اور آپ کے مذہبی و دینی خدمات کو اجاگر کیا جائے۔ اس لئے کہ سیاست و علم دونوں مولانا آزاد کے اندر اتنے بھرپور انداز میں جمع ہو گئے تھے کہ یہ امتیاز نہیں کیا جا سکتا کہ مولانا اصل میں کس میدان کے آدمی تھے، اور آپ کا قلبی میلان و ذہنی رجحان کس طرف زیادہ تھا؟ ــــ لیکن ان کی خاندانی روایات، مذہبی خدمات، اور خود ان کی بھی زندگی کے پیش نظر زیادہ صحیح یہ ہے کہ مولانا در اصل ایک عالم دین، اور ترجمان اسلام تھے، ان کی صلاحیت ولیاقت کی وجہ سے خود سیاست ان کو کھینچ کر میدان عمل میں لے آئی تھی، جیسا کہ وہ خود فرمایا کرتے تھے، کہ میں نے سیاست کو نہیں ڈھونڈا بلکہ سیاست ہی نے مجھ کو ڈھونڈھ نکالا ہے۔

بچپن ہی سے انہیں صحافت کا ذوق پیدا ہوا، اور اس کی طبع آزمائی کرنے لگے چنانچہ ابتدائی مرحلوں کو طے کرنے کے بعد مولانا آزاد کی ادبی زندگی چودہ برس عمر کے بعد شروع ہوئی، اور "لسان الصدق" نامی ایک ماہوار جریدہ نکالنا شروع کیا۔ جس کا عوام وخواص پر اچھا خاصا اثر پڑا، مولانا الطاف حسین حالی نے اس کی تعریف کی۔ ۱۹۰۵ء میں مولانا حالی کی جب مولانا آزاد سے ملاقات ہوئی تو انہیں یقین نہ آیا، کہ اتنا نو عمر لڑکا "لسان الصدق" جیسے